"کیا مطلب ہے؟"

"ایسا آدمی تھا جس کے بارے میں کوئی مستقل رائے قائم کرنا دشوار ہوتا ہے۔"

تھانیدار نے پھر پنسل کے ساتھ رجسٹر میں چند الفاظ لکھے۔ جب اُس نے دوبارہ بات شروع کی تو اُس کا لہجہ یک دم نرمی پر آچکا تھا:

"اچھا۔ کل رات کو کیا ہوا؟"

"کل رات کو؟"

"ہاں۔ کل رات کو۔"

"میں نے دروازے میں روشنی دیکھی تو....."

"اونہوں۔" تھانیدار نے نفی میں سر ہلایا، "اتنی جلدی مت کیجیے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اُس وقت وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔"

"سانس کی وجہ سے؟"

"نہیں۔" اسد نے کہا، "ویسے ہی۔"

"ویسے ہی سے کیا مطلب؟"

"کبھی کبھی رات کو مجھے نیند نہیں آتی۔"

"جب نیند نہیں آتی تو کیا کرتے ہو؟"

"کبھی کبھی ٹہلنے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ اکثر اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا یا لکھتا رہتا ہوں۔"

"خط وغیرہ؟"

"خط وغیرہ بھی۔"

"اور کیا؟"

"کبھی کبھی کوئی نظم لکھتا ہوں۔"

"اوہو۔" تھانیدار کرسی پر آگے سرک کر بیٹھ گیا، "تو آپ شاعر بھی ہیں؟"

اسد خاموش رہا۔

"آپ کس قسم کی نظمیں لکھتے ہیں؟"

"کسی خاص قسم کی نہیں۔"

"رومانی نظمیں؟"

"کہہ سکتے ہیں۔"

"اور قومی نظمیں؟"

"نہیں۔"

تھانیدار لمبا سا "اچھا" کر کے بولا، "پھر کیا ہُوا؟"

"مَیں ٹہلنے کے لیے نکلا۔"

"آدھی رات کو؟"

"ہاں۔"

"تمہیں علم ہے کہ اِس علاقے میں درندے کا خطرہ ہے؟"

"ہاں۔"

"اور پھر بھی تم آدھی رات کے وقت ٹہلنے کے لیے نکلے؟"

"ہاں۔"

تھانیدار خشک سی ہنسی ہنسا: "دلیر آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"شیر ادھر نہیں آتا۔" اسد نے کہا۔

"ہماری اطلاع تو یہ ہے کہ گزشتہ برس اُس نے کئی بار حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"میرے خیال میں یہ محض مبالغہ آرائی ہے۔"

"تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

"کس بات کا؟"

"کہ یہ درندہ کبھی حملہ کرنے کی نیّت سے گاؤں میں نہیں آیا؟"

"نہیں۔"

"اہا ــــ" تھانیدار نے اپنا پتلا سا ڈنڈا ہوا میں اُٹھایا اور فاتحانہ انداز میں اردگرد کے لوگوں کو دیکھ کر بولا، "تو گویا آپ کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں، اور پھر بھی یہ بات آپ پورے یقین سے کہہ رہے ہیں۔ اب آپ کا ثبوت مہیّا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے، جناب؟"

اسد لاجواب ہو کر خاموش ہو رہا۔

"ڈھانچے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"کوئی پرانا ڈھانچا ہے۔"

"ہمارے پاس لیبارٹری کی رپورٹ موجود ہے کہ ڈھانچا چھ ہفتے سے لے کر چھ مہینے تک پرانا ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"کسی اور وجہ سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔"

"تمہارا اس بات پہ یقین ہے کہ یہ ڈھانچا شیر کا شکار نہیں بنا؟"

"ہاں۔"

"اور تمہارے خیال کے اندر یہ بات بالکل سچ ہے؟"

"میرے خیال میں سچ ہے۔ دوسرے لوگوں کے خیال میں نہیں۔"

"مگر تمہیں اپنی بات پر شک کا کوئی گمان نہیں۔"

"نہیں۔"

تھانیدار کی آنکھوں میں اب اصل اچنبھے کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

"اچھا۔ آگے چلو۔" تھانیدار نے کہا۔

"میں واپس آ رہا تھا۔۔۔۔"

"کہاں سے ہے؟"

"ابھی بتا چکا ہوں۔ ٹہلنے نکلا تھا۔"

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مسٹر اسد کریم۔ عقل کو قائم رکھ کر جواب دیجیے۔ کہاں سے واپس آ رہے تھے۔"

"شرقی میدان سے۔"

"شرقی میدان تک ٹہلتے ہوئے چلے گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"گلیوں میں سے ہو کر گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"جاتے یا آتے ہوئے کسی شخص سے تمہاری مڈھ بھیڑ ہوئی یا کوئی نظر آیا؟"

"نہیں۔"

"کوئی سایہ بھی نہیں؟"

"سایہ بھی نہیں۔"

"پھر۔"

"میں احاطے کی اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلا آرہا تھا کہ میری نظر مطب کے دروازے پر پڑی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ میں ٹھٹکا حکیم صاحب کبھی رات کے وقت مطب میں نہیں آتے، جب تک کہ انہیں خاص طور پہ بلایا جائے۔ مگر اس صورت میں احاطے کے اندر مریض کے علاوہ کئی اور لوگ بھی موجود ہوتے ہیں، جب کہ اس وقت احاطہ خالی تھا۔ میں دیوار پھاند کر بھاگتا ہوا مطب تک پہنچا جب اندر داخل ہوا تو ..... لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔"

"تم نے کسی اور شخص کو اس وقت وہاں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"کوئی آواز سنی؟"

"نہیں۔"

"قطعی طور پر نہیں؟"

"قطعی نہیں۔"

"تو گویا، اسد کریم" تھانیدار بولا، "تم تسلیم کرتے ہو اور تم اس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ تم نے ابھی جو روداد بیان کی ہے یہ درست ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہوا اور تم اس وقت مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں ہو۔"

"ہاں۔"

"کیا وقوعے کے بعد تم اپنے کمرے میں جا کر سو گئے تھے؟"

"نہیں۔ میں رات کو کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہا۔"

"تو گویا تم نے کل رات کو شرقی میدان تک جانے اور واپس آنے اور مطب میں داخل ہونے اور لاش

کر دریافت کرنے کے بعد تک کے عرصے میں اپنے اور مقتول کی لاش کے علاوہ کسی میرے شخص کو نہ دیکھا نہ کوئی آواز سنی۔ درست ہے؟"

"ہاں۔"

"جب تم نے پہلی مرتبہ لاش کو دیکھا تو تمہارے خیال میں مقتول کو مرے ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا تھا؟"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں۔" اسد نے کہا، "مگر لاش سرد ہو چکی تھی۔"

"اس کا تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"میں نے لاش کو چھو کر دیکھا تھا۔"

"کہاں پر؟"

"چہرے پر۔"

"کیوں؟"

"مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حکیم صاحب مر چکے ہیں۔"

"جس وقت تم ٹہلنے کے لیے اپنے کمرے سے نکلے، اور جب واپسی پر مطب میں پہنچے، اس کے دوران تقریباً کتنا عرصہ لگ گیا ہوگا؟"

"کوئی ایک گھنٹہ۔"

"تاہم شرقی میدان کی طرف جاتے وقت مطب میں کوئی نہ تھا اور دروازہ بند تھا۔"

"جاتے وقت میں باہر کی دیوار کے ساتھ ساتھ گیا تھا۔ مطب کی جانب میری پشت تھی۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔"

تھانیدار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" وہ بولا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ اسد اور ایک سپاہی اس کے پیچھے ہو لیے۔ باقی سب لوگ صحن میں بیٹھے رہے۔ احاطے میں چارپائیاں لوگوں سے بھری تھیں اور گاؤں کے سب لوگ دوبارہ احاطے کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ تھانیدار کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجمعے پر خاموشی چھا گئی۔ مطب کے کمرے میں داخل ہو کر تھانیدار نے اپنے پتلے سے ڈنڈے کے ساتھ چاروں طرف اشارہ کیا:

"کمرے میں اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ کہ یہاں پر ہر چیز وہی ہے جو تم نے کل رات کو دیکھی تھی؟"

"ہاں۔"

"صرف ہاں یا نہ میں جواب کافی نہیں۔ کھُل کر جواب دو۔"

"یہاں پر ہر چیز وہی ہے جو میں نے کل رات کو دیکھی تھی۔"

"اور اپنی جگہ پر موجود ہیں؟"

"کم و بیش۔" اسد نے کہا، "کچھ اِدھر اُدھر کی ہوئی ہیں۔"

"یعنی ہلی ہوئی ہیں؟"

"ہاں۔"

"مگر کوئی چیز یہاں سے لے جائی یا باہر سے لائی تو نہیں گئی۔"

"نہیں۔"

"سمیت مُردے؟"

پیلے اور بھورے رنگ کی لاش نے اس وقت اسد کے اندر صرف ہلکے سے جذبات پیدا کیے۔

"مُردے سمیت۔" وہ بولا۔

"بس ایک کمرے کے۔" تھانیدار نے احاطے میں کھڑے ہوئے بڈھوں کی جانب مُنہ کرکے اونچی آواز میں گالی دی، "تمہاری داڑھیاں کھینچ کر جوتوں میں دے دوں تو تمہیں پتا چلے، اگاندو۔ کمرے پر ناچ ناچ کر اس کا نشان تک ضائع کر دیا ہے تمہارے ریوڑوں نے ——" وہ اسد کی طرف مُڑا، "چلو۔"

احاطے سے نکلتے نکلتے اسد نے اُسے بتایا کہ کس طرح وہ بیہوش لڑکی کو اُٹھا کر گھر لے گیا اور اُسے گرم گرم دودھ پلا کر لٹانے کے بعد صبح ہونے تک اُس کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

"تمہیں کسی پہ شُبہ ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"سوچ کر جواب دو۔ تمہیں کسی پر شُبہ ہے؟"

"مجھے کسی پر شُبہ نہیں۔"

"کسی پر بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"اِس قتل کے پیچھے کس چیز کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں آتی۔" اسد نے کہا، "دن کے وقت بندوق کا قصّہ ہوا

تھا۔"

"ہاں" تھانیدار نے سوچتے ہوئے سر ہلایا، "ذہن پر زور دے کر سوچو۔ تمہارا مقتول سے قریبی تعلق تھا۔ کوئی سابق مریض۔ کوئی قرض خواہ۔ کوئی ایسا ویسا آدمی جس پہ شک کی وجہ نکل سکتی ہو؟"

"اونہوں" اسد نے نفی میں سر ہلایا۔

چلتے چلتے تھانیدار اُس مقام پہ رُک گیا جہاں سے اسد نے پہلی بار مطب کے اندر کی روشنی کو دیکھا تھا۔

"وہ شرقی میدان ہے" تھانیدار اپنے ڈنڈے سے اشارہ کر کے بولا، "اور وہ تمہارا کمرہ۔ ٹھیک؟"

"ہاں"

"پھر ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہنہہ؟"

"شرقی میدان سے واپسی پر تم سیدھے باہر باہر سے اپنے کمرے کو جا سکتے تھے۔" چند لمحوں تک اسد خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ تھانیدار پھر بولا، "اس طرف سے چکر کاٹ کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی" اسد نے کہا۔

"مَیں خاص وجہ نہیں پُوچھ رہا۔ وجہ پُوچھ رہا ہُوں"

"مَیں زیادہ سے زیادہ دیر تک تازہ ہوا میں رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے لمبے رستے سے آیا۔"

تھانیدار نے طنزیہ لہجے میں لمبی سی آواز نکالی: "اچھا —!"

گھر کے دروازے پر پہنچ کر اُس نے گھر کو اندر سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اس گھر میں کون کون رہتا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"حکیم" اسد نے کہنا شروع کیا، "میرا مطلب ہے اُن کی بیٹی، اور ایک بوڑھی عورت جو گھر کا کام وغیرہ کرتی ہے"

"یہ کام کاج کرنے والی عورت کا کمرہ ہے؟" تھانیدار نے دروازے پر کھڑے کھڑے اندر جھانک کر دیکھا۔ کمرے میں بہت سی بوریاں ایک دُوسری کے اُوپر رکھی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ جو تھوڑی سی جگہ بچ رہی تھی وہاں پہ زمین پر خادمہ کا بستر بچھا تھا۔ "ان بوریوں میں کیا ہے؟"

"جی جنس ہے" تھانیدار کے عقب سے عورت نے جواب دیا۔

یاسمین کے کمرے پہ تھانیدار نے سرسری سی نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔ حکیم کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

"اس کمرے میں کون ہے؟"

"حکیم صاحب کا کمرہ ہے۔" اسد نے کہا، "اُن کی بیٹی یہاں ہے۔"

"اچھا۔ اس کا اب کیا حال ہے؟"

"اچھا نہیں۔"

"ذرا پتا کر کے بتاؤ۔ بیان دینے کے قابل ہے؟"

"میرے خیال میں بیان دینے کے قابل نہیں۔"

"ہُوں۔" تھانیدار سوچتے ہوئے بولا، "چلو خیر۔ اُس کا بیان کل ہو جائے گا۔" وہ چل کر ہیڈ کانسٹیبل کے پاس گیا اور اُس سے کوئی بات کرنے لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ٹین کا صندوقچہ بند کر کے اُسے مقفل کر دیا۔ تھانیدار اسد کی طرف مُڑا، "باقی بیان سٹیشن پر چل کر مکمل ہوگا۔ تمہیں ہمارے ساتھ سٹیشن تک چلنا پڑے گا۔"

"مجھے؟"

"ہاں۔"

اسد ہکا بکا رہ گیا۔ "میرا بیان ختم نہیں ہوا؟"

"اونہوں۔" تھانیدار نے ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"مگر میں نے اپنا بیان ختم کر دیا ہے۔"

"تم ہمارے اکلوتے گواہ ہو۔" تھانیدار بولا، "ابھی بہت سی باتیں مزید دریافت کرنی ہیں۔"

"مگر میں نہیں جا سکتا۔"

"کیوں؟"

"یہاں گھر میں اور کوئی نہیں۔"

"اس کی فکر کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں۔ ہماری یہاں پر مستقل نگہداشت رہے گی۔"

"مگر ——"

حکیم کے کمرے کا دروازہ کھلا اور یاسمین آہستہ آہستہ چلتی ہوئی صحن میں اسد کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ تینوں پولیس والے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگے۔

"آپ انہیں کیوں اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں؟" یاسمین نے کمزور مگر متوازن آواز میں پوچھا۔

"آپ حکیم صاحب کی بیٹی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"مجھے اِس حادثے کا دلی رنج ہے۔ آپ تشریف رکھیے۔" تھانیدار نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ یاسمین وہیں کھڑی خالی خالی سوالیہ نظروں سے تھانیدار کو دیکھتی رہی۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اِس افسوس ناک حادثے کی پوری پوری تحقیقات کی جائے گی۔ اسد کریم موقع کا گواہ ہے۔"

"اس نے اپنا بیان دے دیا ہے۔"

"کچھ باتیں ابھی تفصیل طلب ہیں۔ آپ کا بیان بھی ضروری ہے، مگر کوئی جلدی نہیں۔ کل تک آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی تو لے لیا جائے گا۔"

"اسد نے جو کچھ دیکھا بتا دیا ہے۔ اِس کے علاوہ اسے کسی بات کا علم نہیں۔ میں اس کے ساتھ تھی۔"

تھانیدار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کب؟"

"کل رات کو۔"

"کہاں؟"

"ہم ٹہلتے ہوئے شرقی میدان تک گئے تھے۔"

"آپ دونوں ساتھ تھے؟" پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اسد سے مخاطب ہوا، "تم نے اپنے بیان میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کیوں؟"

اسد نے بوکھلاہٹ میں یاسمین سے تھانیدار، اور تھانیدار سے یاسمین کو دیکھا۔ "میں یاسمین کو اس میں لانا نہیں چاہتا تھا۔"

"لانا نہیں چاہتے تھے؟ واہ۔"

"میرا خیال تھا اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"واہ۔ فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتے ہو کہ تم نے حقیقت کا جزوی طور پر اخفا کیا ہے؟ یہ قتل کی تفتیش ہے، کوئی چوری چکاری کا معاملہ نہیں۔"

"میں بیان دے سکتی ہوں۔" یاسمین کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ بولنے لگی، "جب میں گھر سے گئی تو ابا اپنے

کمرے میں تھے۔ واپسی پر اسد نے مطب میں روشنی دیکھی۔ اُس کے بعد جو اُس نے دیکھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کسی بات کا علم نہیں۔"

تھانیدار کئی لمحوں تک آنکھیں سکیڑے باورچی خانے کے دروازے میں دیکھتا رہا، یوں جیسے اُسے تفتیش کے لیے کوئی نیا سُراغ ہاتھ لگ گیا ہو۔ پھر اچانک اُس کا چہرہ کھِل اٹھا اور اُس نے یاسمین سے سوال کیا:

"شرقی میدان تک جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے کسی شخص سے آپ کی مُنھ بھیڑ ہوئی یا کوئی نظر آیا؟"

"نہیں۔" یاسمین نے جواب دیا۔

"کوئی سایہ بھی نہیں؟"

"سایہ بھی نہیں۔"

"کوئی آواز سُنی؟"

"نہیں۔"

"قطعی نہیں؟"

"قطعی نہیں۔"

"تو گویا آپ نے کل رات کو شرقی میدان تک جانے اور واپس آنے تک کے عرصے میں اپنے اور اسد کریم اور مقتول کی نعش کے علاوہ کسی چوتھے آدمی کو نہ دیکھا، نہ کوئی آواز سُنی۔ درست؟"

"ہاں۔"

"آپ کو کسی پر شبہ ہے؟"

یاسمین خاموش رہی۔

"دیکھیے،" تھانیدار ایک پاؤں اُٹھا کر ڈنڈے سے جُوتے کا تلا بجاتے ہوئے بولا، "آپ کو مطلع کرنا میرا فرض ہے کہ آپ اس وقت پولیس کے تفتیشی افسران کی موجودگی میں ہیں اور بلا خوف و خطر اپنے دل کی بات کہہ سکتی ہیں۔"

"اسی گاؤں سے کوئی ہو گا۔" یاسمین نے کہا۔

"ہاں۔" تھانیدار نے کہا، "حالات کا مجھے علم ہے۔ میں اس وقت آپ کو مزید زحمت نہیں دوں گا۔ وقت آنے پر آپ کا مکمل بیان درج کر لیا جائے گا۔ البتہ ایک آخری سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے

پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ کل رات، واردات کے وقت کے لگ بھگ، آپ اسد کریم کے ہمراہ تھیں ؟"

یاسمین نے ایک لحظے کو سوالیہ نظروں سے اسد کو دیکھا، پھر بولی : "نہیں۔"

"ہوں۔" تھانیدار اوپر کا ہونٹ پھیلا کر اپنی مونچھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"بارش ہونے لگی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی، بڑے زور سے۔" یاسمین نے یوں بات کی جیسے ان باتوں کو گواہی کے طور پیش کر رہی ہو۔

"آپ دونوں اُس وقت کہاں تھے ؟"

"سفید پتھر کے نیچے۔ بارش شروع ہو گئی تھی....."

پھر جیسے معلوم ہوا جیسے تھانیدار نے یکدم اس تفتیش میں اپنی تمام تر دلچسپی کھو دی ہو۔ یاسمین کی بات کے دوران وہ مڑ کر سپاہی سے کوئی بات کرنے لگا۔

"بہرحال،" پھر وہ بولا، "میں ایک بار پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس جرم کی مکمل تحقیقات کی جائے گی اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔ تمہارے تعاون سے ہمارا کام آسان ہو سکتا ہے۔ اسد کریم کو بہرحال اپنے ہمراہ لے جانا ضروری ہے۔ یہ اکلوتا عینی شاہد ہے۔"

"مگر اس نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔" یاسمین نے کہا، "میں اس کے ساتھ تھی۔"

"جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس کی واحد گواہی ہے۔ اس کیس کے لیے اشد ضروری ہے کہ اس کا مفصل بیان جلد از جلد مکمل کر لیا جائے۔" تھانیدار دروازے کی طرف چل پڑا۔ چاروں دوسرے آدمی اُس کے پیچھے پیچھے دروازے سے باہر نکل گئے۔ صحن میں یاسمین اور اسد کھڑے رہ گئے۔ بوڑھی عورت چارپائی پر بیٹھ کر پھر رونے لگی۔

یاسمین نے دونوں ہاتھوں سے اسد کا بازو پکڑ لیا اور خوفزدہ آواز میں بولی :

"مت جاؤ۔"

"کوئی بات نہیں۔" اسد نے بازو چھڑا کر اس کے کندھوں کے گرد ڈال دیا، "شام تک واپس آ جاؤں گا۔"

"مت جاؤ، اسدی۔" وہ بے دم لہجے میں بولی، "میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یاس۔" اسد نے کہا، "میں انکار کیسے کر سکتا ہوں ؟"

نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبائے، پھیلی ہوئی آنکھوں والا گنگ چہرہ اُس نے کئی بار نفی میں ہلایا، پھر سر اسد کے سینے پر رکھ کر خشک آنکھوں سے روتی ہوئی بولی: "نہیں مت جاؤ، اسدی۔"

اسد احاطے میں داخل ہو رہا تھا جب اُس نے اُس مجمعے پر نگاہ ڈالی جو تین طرف سے احاطے کی دیوار کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ دُور دُور تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ میر حسن اُن میں موجود نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گشتہ کی ساری آبادی، مرد عورتیں بچے، وہاں پر آ جمع ہوئی تھی، اور ان سب کی آنکھیں اُس پر لگی تھیں۔ اسد نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک بہت بڑی بندوق کی مار پر چل رہا ہے، اور وہ مہیب نالی اُسے شست پہ لیے اُس کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی جا رہی ہے۔ اُن سینکڑوں آنکھوں کی مجموعی نظر تلے اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا تھانیدار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چشم زدن میں، ایک ان کہے فرمان کے تحت، وہ ایک ملزم بن چکا تھا۔ لاش کو ایک چارپائی پہ ڈال کر اُسے سفید چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ مطب مقفل پڑا تھا۔ سورج غروب ہونے میں کوئی دو گھنٹے تھے۔ گاؤں والوں کی طرف سے دیے گئے چار مزدوروں نے چارپائی کندھے پر اُٹھائی، اور وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ مجمعے نے شرقی میدان تک اُن کا تعاقب کیا۔ چند بڈھے جنگل میں کچھ دُور تک اُن کے ہمراہ گئے، جہاں سے تھانیدار نے انہیں واپس کر دیا۔ پھر اسد، سر جھکائے چلتا ہوا، اُن تین آدمیوں کے ساتھ راستے کی ڈھلان پر اُتر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

(۵)

فرار کی خواہش کے پیچھے ایک خیال ہر دم اسد کے دل میں گشت کرتا تھا : یہ شخص، گمشدہ دالاحکیم عُمرؔ، آخر چاہتا کیا تھا۔ اُس عجیب و غریب شخص کی زندگی کا راز کیا تھا ؟ اب یہ راز جاننے کا وقت ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

گو اُمید کی ایک کرن ابھی باقی تھی کہ ایک نہ ایک دن کہیں نہ کہیں پر وہ میر حسن کو جا لے گا، اور اُس سے حقیقت معلوم کرے گا، اس معاملے کی حقیقت کہ یہ شخص آدھی رات کو وہاں بندوق ہاتھ میں لیے کیا کر رہا تھا، میر حسن وہاں پر کیسے پہنچا، اور اصل قاتل کون تھا، اُس کا مقصد کیا تھا۔ شاید میر حسن کو پتا ہو۔ اُس وقت اگر، اسد نے سوچا، میں اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتا، اور آرام سے لڑکے کی بات سُنتا، تو آج اس مصیبت خانے میں کیوں ہوتا — اب دیکھو !

حوالات کی آٹھ فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی کوٹھڑی کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ اور پتھر کا فرش تھا جس پر دو بھورے رنگ کے پتلے کمبل، ایک بچھانے اور ایک اوڑھنے کے لیے، دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔

ایک بڑا سا بھاری ہموار پتھر آدھا زمین میں گڑا ہوا، نجانے کس مقصد کے لیے وہاں موجود تھا جس کو اسد تکیے کے، اور کبھی چوکی کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایک کونے میں رفع حاجت کے لیے ٹین کا گندا سا برتن پڑا تھا۔ اس کوٹھڑی میں اسد دو راتیں اور ایک دن بسر کر چکا تھا جس کے دوران صرف تین مرتبہ اُسے تھانیدار کے روبرو لے جایا گیا تھا۔

ہاں، آرام سے اگر وہ اسد نے سوچا، اُس رات کو میر حسن کی بات سُنتا تو آج یہاں نہ ہوتا۔ مگر عمیر، اُمید کی ایک کرن ابھی باقی تھی۔ (ایک بار پھر وہ اپنے پُرانے مشغلے میں لگا تھا ــــ نت نئی، دور از کار اُمیدوں کی کرنوں کو دریافت کرنے، اور اُن پر اطمینان سے وقت گزارنے کے مشغلے میں،) گُشدہ سے پولیس سٹیشن تک کے سفر میں حوالات کا جو ذہنی نقشہ اُس نے بنایا تھا وہ تو کم و بیش ٹھیک نکلا۔ اُسے حیرانی اُس وقت ہوئی جب اُس کو بوٹ اُتارنے کے لیے کہا گیا۔ جوتے اُتارنے کی کیا تُک تھی؟

"کیوں؟" اُس نے سوال کیا۔ جس کے جواب میں سپاہی نے درشتی سے محض اپنا حکم دہرایا، "جوتے اتارو۔" چنانچہ وہ چپکے سے جوتا اُتار کر کوٹھڑی میں داخل ہوا۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کھڑے رہنے کے بعد وہ جا کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ پوچھنے کا یہاں کیا فائدہ؟ اُس نے بدلی سے سوچا۔ اپنے ننگے پاؤں کو دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ جیسے وہ کسی پاک جگہ پر ہے۔ ننگی دیواروں اور ننگے پتھریلے فرش والی یہ جگہ کسی عبادت گاہ سے ہی مشابہ تھی، جیسے کوئی مسجد ہو۔ ایک عرصہ ہوا، اُس نے چونک کر سوچا، وہ مسجد نہیں گیا تھا۔ آٹھ؟ نو سال؟ اس عرصے میں اُس نے کسی قسم کی عبادت نہیں کی تھی کیونکہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ایک بار پھر (متعجب ہو کر) اُس نے سوچا کہ اتنا عرصہ عبادت نہ کرنے کے خیال پر اُس کے دل میں کوئی تاسف پیدا نہیں ہوا! اور ایک وقت تھا کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ خدا کے حضور سجدہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے چھوڑ کیوں دیا تھا؟ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اُس نے محلے کی مسجد میں پانچ وقت نماز کے لیے جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے نصیحت کی تھی کہ اسے حتیٰ الوسع باقاعدگی سے نماز پڑھنی چاہیے۔ اس کے باپ نے نماز کی نیکیاں بھی بتائی تھیں: دل اور دماغ کی پاکیزگی۔ اور اس کے فوائد: ثوابِ دارین، اعتماد، ضبط، تحمل۔ اُس وقت اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔ مگر ایک بات تھی جس کا براہِ راست تعلق نماز سے تھا۔ یہ وہ احساس تھا جو اُس کے اندر وضو کر لینے کے بعد پیدا ہوتا ــــ ایک ایسی کیفیت جو وضو کر لینے اور اِسے زیادہ سے زیادہ دیر تک قائم رکھنے سے آتی تھی۔ وضو کرنے کے بعد وہ نماز پڑھتا، اور پھر وہ مسجد سے باہر آتا تو اس کیفیت میں ہوتا۔ وہ اس کیفیت کو بھلا کیسے بیان کر سکتا تھا؟ ہاں، یہ

کیفیت اُس کے اندر ہی نہیں بلکہ باہر بھی اُس کے بدن کے اوپر طاری ہوتی تھی، ایک اَن دیکھی مضبوط جلد کی مانند جس میں کوئی جوڑ نہ لگا ہو۔ یہ جلد اُسے ایک اکائی کی صورت میں باندھے رہتی، یک جا قوی رکھتی۔ اُسے احتیاط لازم تھی کہ وہ گندی زبان استعمال نہ کرے، پیشاب وغیرہ نہ کرے اور اگر کرے تو پیچھے اُس کے بدن پہ نہ پڑیں، ہوا خارج نہ کرے اور پیٹھ پیچھے کسی کی بُرائی نہ کرے۔ اگر ان میں سے کوئی سی بات بھی کر بیٹھتا تو سیدھا تکیے پر جا کر دوبارہ وضو کرتا خواہ نماز کا وقت ہوتا یا نہ ہوتا۔ جماعت کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اگر اُس کا وضو ٹوٹ جاتا تو اُس کے دل میں زیاں کا احساس رہتا۔ ایسی دل کش کسی کیفیت سے بھی وہ لڑکپن کی عمر میں اور نہ اُس کے بعد کبھی آشنا ہوا تھا۔ ثابت و سالم ہونے کی یہ کیفیت! یہ بڑی پُرشکوہ، بڑی ہی عزیز اور کنواری کیفیت تھی جس پہ زمانے کا ایک دھبا تک نہ تھا۔ نامعلوم طور پر، زندگی کے کسی مرحلے پر وہ کیفیت کہیں کھو گئی۔ اُسے پتا بھی نہ چلا کہ کب، اور کیسے۔ ایک مدت تک اُس کے بعد وہ باہر مسجد میں جاتا اور رٹی ہوئی نماز ادا کرتا رہا اور جب جا کر اُس کو اِس بات کی خبر ہوئی۔ تب اُس وقت اُس کی باقاعدگی میں فرق آنے لگا۔ آہستہ آہستہ اگلی مسجد جانا بالکل چھوٹ گیا۔ اُس کی عمر میں یہ شاید پہلی شے تھی جو اُس کے ہاتھ آئی تھی اور ضایع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ایک مدت کے لیے اُس کا دل اُکھڑ گیا، کوئی شے اُس کے دل کو نہ لگی، کسی شے کی اُسے پروا نہ رہی، جیسے کہ اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوٹھڑی کی ایک دیوار پر ہوا داری کی خاطر ایک اونچا سا روشن دان نکالا گیا تھا جس کی سلاخوں میں آسمان کا ایک چوکھٹا مقید تھا۔ وہ اب نماز پڑھے یا اسد نے دوبارہ ننگے پاؤں کو دیکھ کر سوچا۔ دعا مانگنے کا اگر کوئی وقت تھا تو یہی تھا —— جُوتے اُتروانے کی کیا تک ہے بھلا۔ کچھ بتاتے نہیں، اندھوں اور بہروں کی طرح حکم دیے جاتے ہیں، جیسے رٹی ہوئی زندگی گزار رہے ہوں۔

انتہائی تھکاوٹ کی وجہ سے ایک ظاہری جمود اُس پہ طاری تھا، مگر نیچے نیچے غیض و غضب کی ایک لہر اُس کے اندر کودتی رہی۔

آدمی تو شاید ٹھیک ٹھاک تھا۔ ولی جیسے شخص نے بھی کہا تھا کہ میں اِس پہ یقین کرتا ہوں، اس نے کبھی جھوٹ بات نہیں کی۔ بات ٹھیک ہی تھی۔ اُس نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے علاج سے مکمل طور پہ تندرست کر دے گا۔ یہی کہتا تھا کہ ٹھیک ہو جاؤ گے، صبر کرو، صبر سے علاج کرو تو آرام آ جائے گا۔ آرام تو آتا رہتا تھا، جسم کی گرانی رفع ہوتی رہتی تھی۔ مگر صبر کون کرتا تھا؟ بے صبری میں وہ سارا وقت ضایع کر دیتے تھے جو صبر کرنے کے کام آتا۔ مگر وقت بہرحال وقت تھا، اِس کی خاصیت زیاں کی خاصیت تھی، جیسے ایک سانس جو کھینچا جاتا ہے، ہر چند کہ ابھی بدن کے اندر مقید ہوتا ہے، بدن کے اختیار سے نکل چکا ہوتا ہے، خارج کرنے

کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ سانس کی خاصیت کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ بندوق کو نکال کر ہاتھ میں پکڑے آدھی رات کو، اسد نے سوچا، وہ کیا کر رہا تھا؟ اگر گھر لے جانے کے لیے آیا ہوتا تو ڈبے میں بند کی بند اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ میر حسن اگر بندوق چرانے کی غرض سے آیا تھا تو اول اُسے پتا ہی کیسے چلا کہ بندوق مقلب کی الماری میں رکھی ہے؟ سربستہ راز! میر حسن کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ رات پڑے ایک سپاہی اُس کا کھانا لے کر آیا۔ سپاہی نے اُسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ بٹھایا، بالوں سے پکڑ کر اُس کے منہ پر چپتیں لگائے، اسد نے کئی بار آنکھیں کھولیں، مگر دو دن اور ایک رات کی بے خوابی نے اُسے بیہوش کر رکھا تھا۔ آخر تھک کر سپاہی نے اُس کی رانوں پہ ایک ٹھڈا لگایا اور گالیاں دیتا ہوا نکل گیا۔

اسد جب سو کر اٹھا تو دن کی روشنی دروازے میں سے اندر آ رہی تھی اور پیتلے رنگ کا شوربہ مٹی کے برتن میں اُس کے پاس رکھا سرد ہو چکا تھا۔ جوار کی آدھی روٹی، جو شاید برتن کے کنارے پر رکھی گئی تھی، زمین پہ گری پڑی تھی۔ اسد کو گہرے زرد رنگ کا تھوڑا سا پیشاب آیا۔ سخت قبض کی حالت میں وہ کچھ دیر تک ٹین کے برتن پر بیٹھا جوار کی روٹی کو گھورتا رہا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ جب دو گھنٹے تک کوئی اُسے پوچھنے نہ آیا تو اُس نے روٹی کے ٹکڑے کو اٹھا کر کپڑوں سے پونچھا اور بے مزہ شوربے کے ساتھ چبا چبا کر کھانے لگا۔

دوپہر سے ذرا پہلے اُسے تھانیدار (کلیم اللہ خان) کے سامنے پیش کیا گیا۔ تھانیدار نے چند مختصر سے سوالات پوچھ کر اُن کے جوابات ایک ردّی سے سادہ کاغذ پہ درج کیے۔ پھر تھانیدار نے اُس کی عمر کے بارے میں استفسار کیا۔ "انیس سال گیارہ مہینے،" اسد نے بتایا۔ اس کے بعد اسد کو واپس حوالات لے جا کر بند کر دیا گیا۔ دو گھنٹے کے بعد دوبارہ پیشی ہوئی۔ اس بار جیسے ہی اسد تھانے کے دفتر میں داخل ہوا اُس نے محسوس کیا کہ ماحول یکسر بدل چکا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کی ٹکٹکی، تین سپاہیوں کے کھڑے ہونے کا بیباک انداز، اور تھانیدار کے چہرے کی خشونت۔ چھوٹتے ہی تھانیدار نے اُس سے سوال کیا:

"اقبالِ جرم کر رہے ہو؟"

"کیسا اقبالِ جرم؟"

"کرتوتے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہے، اور کیا۔"

اسد باری باری ہر ایک کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ تھانیدار کرسی سے اٹھا اور میز کے گرد سے نکل کر اُس کے سامنے آ رکا۔ وہ اپنے دونوں بازو چھاتی پہ باندھ کر ایک چوڑے میز پر رکھ کر بیٹھ گیا۔

"تھ تھ تھ۔" اُس نے مصنوعی تاسف سے سر ہلایا، "تم اتنے معصوم نہیں جتنے دکھائی دیتے

ہو۔"

"مَیں نے کیا کیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"اُس بڈھے کو قتل کیا ہے۔"

"نہیں۔"

تھانیدار نے کس کے دو تھپڑ اُس کے مُنہ پہ مارے۔ اسد نے خون کا نمکین مزا دانتوں میں محسوس کر کے، مُنہ ہلائے بغیر زبان دانتوں پہ پھیری۔

"بند کر دو اِسے۔" تھانیدار نے ایک سپاہی کو حکم دیا "اس کا مزاج ابھی درست نہیں ہُوا۔"

کوٹھڑی میں پتھر پہ اکڑوں بیٹھے بیٹھے، کھٹے سوڑھے کو زبان سے سہلاتے ہُوئے، اُسے بہت سی پُرانی پُرانی دھنیں یاد آتی رہیں۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک سپاہی کھٹاک سے دروازے کا کُنڈا کھول کر اندر داخل ہُوا اور اسد کو بازو سے پکڑ کر چلاتا ہُوا دفتر میں لے گیا۔ اسد نے اپنے آپ سے اس بار ہوش و حواس قائم رکھنے کا عہد کیا۔

اُس کا بازو چھوڑنے سے پہلے سپاہی نے اُسے جھنجھوڑ کر سیدھا کھڑا ہونے کی تنبیہہ کی۔

"دماغ ٹھکانے آیا؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"میرا دماغ ٹھکانے پر ہے۔"

"گویا تم اقبالِ جرم کر رہے ہو؟"

"مَیں کسی ایسی بات کا اقبال نہیں کر رہا جو مَیں نے نہیں کی۔"

"اوہو، اب تو تم چاخ پاخ بول رہے ہو، شاعر صاحب۔"

"مَیں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔ مَیں نے کچھ نہیں کیا۔ مَیں صرف ایک گواہ ہُوں۔"

"تمہیں معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"مَیں تمہیں بتاتا ہُوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری عُمر یہاں" اُس نے اپنا ڈنڈا اُٹھا کر حوالات کی کوٹھڑی کی جانب اشارہ کیا "سڑتے رہو گے۔"

"آپ لوگ مجھے زیادہ سے زیادہ پیٹ سکتے ہیں یا گالیاں دے سکتے ہیں۔ مگر مُجرم قرار نہیں

دے سکتے۔" اسد نے کہا۔

"اوہو ہو۔ تو گویا ہم یہی کچھ کر سکتے ہیں؟ اُو ہُوں۔" تھانیدار نے چالاکی سے سر ہلایا، "تجھ جیسے نازک اندام لڑکے کو مارنے پیٹنے کا کیا فائدہ؟ تیرے تو یہاں چاہنے والے ہی بہت ہوں گے۔" اسد کے ساتھ کھڑا سپاہی ہاتھ بڑھا کر اُس کے چُوتڑ مسلنے لگا۔ اسد اُس کے ہاتھ کی زد سے باہر کھسک کر کھڑا ہو گیا۔ "مَیں تو رات کو پھر گشت جا رہا ہُوں۔ پیچھے لال خاں تمہارا انچارج ہے۔ سردی لگی تو اسے بلالینا۔ تمہارا بستر گرم کر دے گا۔" سپاہی لال خاں نے اسد کے گال پر ایک سخت سی چٹکی بھری۔ اسد نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "بُلانے کی کیا ضرورت ہے جی۔" سپاہی بولا، "ہم خود ہی حاضر ہو جائیں گے۔ ایسے ایسے نرم لڑکے کوئی روز روز آتے ہیں؟" اسد آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا۔ "تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔" وُہ رُکتے ہوئے گلے سے بولا، "تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔"

"ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ثبوت موجود ہے۔"

"کیا ہے؟"

"ایسے جیسے یہ دن چڑھا ہے۔" تھانیدار ہاتھ پھیلا کر خلوص سے بولا، "مقتول کے طریقۂ علاج سے بددل ہو کر تم گشت چھوڑ گئے۔ جب تین ہفتے کے بعد واپس لوٹے تو تمہارے پاس ایک سوچی سمجھی ہوئی سکیم تھی۔ تم نے اپنا راستہ ہموار کرنے کے لیے کسی نہ کسی طریقے سے اُس کے گھر تک رسائی حاصل کی۔ مزید تفتیش سے پتا چلے گا کہ یہ کارروائی کیسے عمل میں آئی، مقتول کی لڑکی پر ڈورے تم نے پہلے ڈالے یا بعد میں۔ بہرحال اُس کے ساتھ تم نے تعلقات قائم کیے اور قابلِ مذمت حد تک بڑھا لیے۔ تمہارا مقصد اس سٹیج پر مقتول کی لڑکی سے، جو مطب کے کام میں اپنے باپ کی شریک تھی، اپنی دوائی کا نسخہ حاصل کرنا تھا۔ اس کے علاوہ تم لڑکی کے ساتھ اپنے طول پکڑتے ہوئے تعلقات کو زمانے کی نظروں سے چھپا کر نہ رکھ سکے۔ آدھے سے زیادہ گاؤں کو اس کا علم ہو چکا تھا۔ تمہیں اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر یہ بات مقتول کے علم میں آ گئی تو اُس کا ردِ عمل بڑا سخت ہو گا۔ اُس کی زندگی کا واحد سہارا اُس کی لڑکی ہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ تمہیں کھڑے کھڑے مطب سے نکال دیتا۔ لڑکی بھی ہاتھ سے جاتی اور علاج بھی۔ چنانچہ تم نے اُس کا کام تمام کرنے کی سکیم کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھان لی۔ واردات سے پہلے اور واردات کے بعد صرف دو آدمیوں نے مقتول کو دیکھا۔ ایک مقتول کی لڑکی تھی اور دُوسرے تم۔ لڑکی اس جرم میں تمہارے ساتھ شریک ہے یا نہیں، اس کا ابھی ہمیں علم نہیں۔ مگر تفتیش جاری ہے۔ جلد یا بدیر سچائی نکل آئے گی۔"

"سچائی میں نے آپ کو بتا دی ہے۔" اسد نے کہا۔

"دیکھو —" تھانیدار آگے جھک کر نرم لہجے میں بولا، "آخر اُس بڈھے شیطان کو کون نہیں جانتا تھا۔ علاقے بھر میں وہ مشہور تھا۔ کسی نہ کسی نے ایک دن تنگ آکر اُس کا کام تمام کرہی دینا تھا۔ تمہاری بدقسمتی ہے کہ بلا تمہارے سر آپڑی۔ حاشا وکلا میں تمہیں اس میں قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ بُرائی کو ختم کرنا کوئی جرم نہیں۔ مگر قانونی چارہ جوئی کا معاملہ ہے، مکمل کرنی ہی پڑتی ہے۔ قانون میں مگر چھوٹ ہے۔" اُس نے سمجھانے کے انداز میں اُنگلی کھڑی کی، "قانون اندھا نہیں۔ قانون خدا خوف انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ حالات و واقعات کا مقدمے کے فیصلے پر براہِ راست اثر پڑتا ہے اور حالات و واقعات بیان کرنا میرا فرض ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مقدمے میں تمہاری جتنی مدد ہو سکی کروں گا۔ عین ممکن ہے کہ میرے بیان کے اوپر تم بالکل معمولی سی سزا پر چھوٹ جاؤ۔ مگر شرط یہ ہے کہ سچائی بیان کرنی ہوگی۔"

"میں نے جو کچھ دیکھا ہے بتا دیا ہے۔" اسد نے کہا، "میں نے سچی گواہی دی ہے۔" تھانیدار نے کرسی سے اُچک کر اپنا ڈنڈا اِس زور سے میز پر مارا کہ میز پر پڑی ہوئی دو پنسلیں اُچھل پڑیں اور ایک زبردست دھماکا ہُوا۔

"لے جاؤ۔" وہ گرجا، "اِس مادر زنا" "گراہ" کو۔"

★ ★ ★ ★ ★

سہ پہر کے وقت وہی پیتلے رنگ کا پتلا سا شوربہ اور جوار کی آدھی روٹی اُس کے لیے لائی گئی۔ اسد نے کہا، "مجھے بھوک نہیں۔" جس کے جواب میں سپاہی آنکھیں نکال کر بولا، "جب گانڈ کے رستے شوربا چڑھا تو تیرے باپ کو بھی لگے گی، بیٹا۔ کھا۔" وہ چیخا۔ پتھر پر بیٹھ کر اِس ٹھنڈے نمکین شوربے کے گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اسد نے سوچا، یہاں سے کیسے نکلوں؟ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا ہے۔ مگر کیسے؟ پھسلنے والا برتن خالی نہیں کیا گیا تھا اور پیشاب کی تیز بو کوٹھڑی میں پھیل رہی تھی۔ اس کو خالی کرنے کے لیے فرش میں ایک سوراخ ہونا چاہیے، اُس نے

بے دھیانی سے سوچا، جس کے مُنہ کو اینٹ سے بند کیا جا سکے تاکہ بُو نہ پھیلے۔ اسد کو محسوس ہوا کہ جیسے اُس کا ذہن دو بالکل مختلف تہوں میں بٹ گیا ہے۔ اُوپر والی تہہ کا رنگ گدلا ہے جس کے آرپار کچھ نظر نہیں آتا۔ اُس کے اندر ایک خلفشار کی کیفیت ہے۔ بے شمار چیزیں ننھی ننھی مچھلیوں اور دُمدار مینڈکوں کی مانند اندھا دُھند بے سمتی سے بھاگ رہی ہیں، ایک دُوسرے سے ٹکرا کر سر پھوڑ رہی ہیں اور چیخ پکار کر رہی ہیں۔ جب کہ دُوسری تہہ جو پہلی سے نچلی سطح پر واقع ہے، شیشے کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اُس کے اندر خلاء کی سی کیفیت اور روشنی ہے، اور کہیں کہیں پر کوئی شے، کوئی چہرہ، کوئی آواز، کوئی کوئی بات، بڑی واضح اور عام فہم طور پر گڑی کھڑی ہے یا اپنے محور کے گرد بڑی آسانی اور دلجمعی کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ شوربہ ختم کر کے اسد نے بچی ہوئی ایک چپیڑ روٹی کمبل کے نیچے چھپا دی اور پاؤں پتھر پہ رکھ کر، گھٹنے چھاتی سے لگا کر بیٹھ گیا۔ جرم کا موڑ تو اس نے ثابت کر دیا ہے، کوشش کر کے اس نے سوچنا شروع کیا۔ جھوٹا سا سچا، مگر موڑ اس نے بنا لیا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ ایک بات بہرحال اُمید افزا ہے۔ یہ سب محض واقعاتی شہادت ہے۔ کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں ہو سکتا۔ کوئی آلۂ قتل۔ کوئی عینی شاہد۔ کچھ نہیں۔ جُرم کا عینی شاہد تو کوئی بھی نہیں، میں بھی نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا، اسد نے حسرت سے سوچا، اگر میں نے میرحسن کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہوتا، یا اُس نے ہی کسی کو دیکھا ہوتا، کسی کا نام لیا ہوتا، معاملہ صاف ہو جاتا۔ کوئی الزام دھرتا، کسی پہ الزام آتا، فیصلہ ہو جاتا۔ یہ معاملہ ایسا گنجلک کیوں ہو گیا ہے؟ معاملے دوٹوک کیوں نہیں ہوتے؟ کہ یہ اچھا ہے، یہ بُرا۔ یہ درست ہے، یہ غلط۔ اچھا اور بُرا تو مگر مذہبی وطیرہ ہے، اُس نے سوچا، اور غلط یا درست قانونی نقطۂ نگاہ۔ پھر پیچھے کیا بچا؟ معاملے کا گنجلک ہو جانا قدرتی امر ہے۔ کیونکہ ذمہ داری کا سوال بیچ میں آتا ہے، جو دوٹوک معاملہ ہرگز نہیں۔ اب صُورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ میرحسن آخر میری ذمہ داری کیسے بن گیا؟ کسے پتا تھا کہ حالات یہ رُخ اختیار کر لیں گے، کہ مجھے ہی قیدی بنا لیا جائے گا؟ صُورتِ حال کی تبدیلی سے ذمہ داری کی نوعیت بھی آخر بدل جاتی ہے۔ سب سے اوّل مجھے اپنا تحفظ لازم ہے۔ میرحسن کا نام اب بھی میرے اختیار میں ہے۔ ایک جملہ کہوں اور آزاد ہو جاؤں۔ آزاد! آزادی کا خیال آتے ہی اسد کے دل میں ایک ہُوک اُٹھی۔ کسی نہ کسی صُورت مجھے یہاں سے باہر نکلنا ہے، اُس نے سوچا۔ میں قید میں نہیں رہ سکتا۔

مگر کیا صُورت ہو؟

رات کو وہی سپاہی تھوڑا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا اور اُس وقت تک بیٹھا مونچھیں مروڑتا رہا جب تک کہ اسد نے کھانا ختم نہ کر لیا۔ نمکین پانی جیسے شوربے اور ریتلی روٹی کو ہاتھ لگانے کو بھی اسد کا جی نہ چاہ رہا